دینی علوم کی تدریس

(ہندستان کے مدارس کا نصاب اور اس کی خصوصیات)

مولانا سید جلال الدین عمری

ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

مولانا سید جلال الدین عمری موجودہ عہد کے ان معتبر اور بالغ نظر علما میں ہیں، جن کے علم و فضل، فہم و بصیرت اور تفقہ و بالغ نظری کا اعتراف ہر طبقے میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے دینی و ملی موضوعات پر سوچنے اور غور کرنے کا ایک انداز دیا ہے اور ان کے افکار و خیالات سے پڑھے لکھے اور سنجیدہ طبقوں میں روشنی و رہ نمائی حاصل کی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب دینی علوم کی تدریس (ہندستان کے مدارس کا نصاب اور اس کی خصوصیات) دراصل مولانا سید جلال الدین عمری کا وہ مقالہ ہے، جو انھوں نے جماعتِ اسلامی ہند کے شعبۂ تعلیم کی طرف سے ۲۵ر تا ۲۷ر دسمبر ۲۰۰۳ء کو حیدر آباد میں منعقد ہونے والے ایک تعلیمی کیمپ میں پیش فرمایا تھا۔ اس کے بعد یہ ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ کے سہ ماہی ترجمان تحقیقاتِ اسلامی کے شمارے (اکتوبر- دسمبر ۲۰۰۸ء) میں شائع ہوا، جس کے مدیر خود مولانا محترم ہیں۔ اب مولانا موصوف کی نظر ثانی اور ضروری حذف اور اضافے کے بعد اسے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

مولانا محترم نے اپنے ادارتی نوٹ میں اس مقالے کے سلسلے میں فرمایا ہے کہ ''یہ درس و تدریس کی دنیا سے عملاً غیر متعلق آدمی کا اظہار خیال ہے۔ اس میں بہت زیادہ گہرائی میں جانے کی کوشش بھی نہیں کی گئی ہے۔'' یہ محض مولانا محترم کا انکسار ہے، جو ان کی شخصیت کا جزو بن چکا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مقالہ ''بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر'' کا حقیقی مصداق ہے، جو اپنے اندر غیر معمولی افادیت رکھتا ہے۔

چناں چہ مقالے کی اہمیت کے پیش نظر شعبۂ تعلیم کے سکریٹری محترم محمد اشفاق احمد اور بعض دوسرے ذمے داروں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اسے کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ تاکہ اس کی افادیت عام ہوسکے۔ اس میں مدارس عربیہ کے لیے بعض باتیں غور و فکر کی طالب ہیں۔ ایک دوسرے پہلو سے بھی اس کی اہمیت محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب بالعموم مدارس کے سلسلے میں ان باتوں سے واقف نہیں ہوتے، جن کا مولانا موصوف نے مقالے میں ذکر فرمایا ہے، امید ہے کہ انھیں دینی مدارس کے مسائل کو سمجھنے اور ان کے سلسلے میں صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی۔

یقین ہے کہ مولانا محترم کی دوسری کتابوں کی طرح زیر نظر کتاب دینی علوم کی تدریس (ہندستان کے مدارس کا نصاب اور اس کی خصوصیات) بھی کام یابی و مقبولیت کا ریکارڈ قائم کرے گی۔

ناشر

دینی علوم کی تدریس

(ہندستان کے مدارس کا نصاب اور اس کی خصوصیات)

برادرانِ محترم! اس وقت کی گفتگو کا موضوع ہے: 'دینی علوم کی تدریس، ہندستان کے مدارس کا نصاب اور اس کی خصوصیات'۔

ہم سب جانتے ہیں کہ مدارسِ دینیہ، دینی علوم کے مراکز ہیں۔ یہیں سے صحیح معنوں میں دینی علوم کی تکمیل ہوتی ہے اور دینی علوم کے مختلف شعبوں کی درس و تدریس کا ان مدارس میں طویل عرصے سے ایک نظام قائم ہے۔

دینی تعلیم اور عہد صحابہؓ

دین کی تعلیم کا دور اول سے ایک سلسلہ رہا ہے۔ اگر آپ دیکھیں تو صحابہ کرامؓ کے عہد مبارک تک اس کا تسلسل ملے گا۔ صحابہ کرامؓ میں سے بعض حضرات مخصوص علوم کے ماہر ہوتے تھے اور نبی ﷺ نے خود توجہ دلائی کہ دین کے فلاں شعبہ کا علم فلاں صحابی سے حاصل کیا جائے۔ پھر بعد میں ان کی یہ حیثیت اور زیادہ نمایاں ہوگئی۔ روایتِ حدیث میں حضرت ابوہریرہ، حضرت عائشہ، حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ اسی طرح فقہی بصیرت کے لحاظ سے

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم نمایاں رہے۔ علم فرائض یا احکام وراثت میں حضرت زید بن ثابتؓ کو امتیاز حاصل تھا۔ حلال وحرام کے احکام سے حضرت معاذ بن جبلؓ کی واقفیت زیادہ تھی۔ یہ حضرات ان مختلف میدانوں میں لوگوں کا مرجع بنتے چلے گئے۔ صحابۂ کرام کے بعد تابعین کے دور میں بھی دینی علوم کا چرچا رہا اور اس کی جو شکل عہد رسالت اور عہد صحابہ میں تھی وہ کچھ زیادہ منظّم اور مربوط ہونے لگی۔ مساجد میں خاص طور پر اور کبھی کبھی گھروں پر بھی اصحابِ علم کے حلقے ہوتے تھے اور طالبان علم کے لیے استفادے کی راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ مثال کے طور پر حضرت سعید بن مسیّبؒ، جنھیں سید التابعین کہا جاتا ہے، مسجد نبوی میں ان کا حلقۂ درس قائم تھا۔ جس میں وہ احادیث رسولؐ پیش فرمایا کرتے تھے اور طلبہ انھیں سنتے بھی تھے اور نوٹ بھی کرتے تھے۔ اسی طرح کوفے میں حضرت علقمہ ابن قیسؒ اور حضرت ابراہیم نخعیؒ کے حلقے تھے۔ مکہ مکرمہ میں عکرمہؒ، عطاء بن ابی رباحؒ اور طاؤس بن کیسانؒ جیسے اہل علم وفضل تھے۔ مدینہ میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام نافعؒ اور سالم بن عبد اللہ بن عمرؒ مرجع کی حیثیت رکھتے تھے۔ لوگ ان حضرات سے مسلسل اخذ واستفادہ کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ کس مسئلہ میں کس سے رجوع کیا جانا چاہیے؟۔

دینی تعلیم کا ارتقا

صحابۂ کرام، تابعین اور پھر تبع تابعین کے دور میں کتاب وسنت کی تدریس اور اشاعت کا اسی طرح تسلسل رہا۔ بعد میں آہستہ آہستہ خالص قرآن و حدیث کے علوم کے ساتھ یونانی فلسفہ اور دیگر علوم بھی شامل ہوگئے۔ حضرت معاویہؓ کے عہد ہی سے اس کا آغاز ہوگیا۔ بعض یونانی کتابوں کے عربی میں تراجم ہوئے، لیکن بنو عباس کے دور میں اس کی طرف زیادہ توجہ ہوئی اور بڑی تیزی سے یونانی علوم منتقل ہوئے۔ ان میں فلسفہ، منطق اور علم کلام جیسے عقلی علوم بھی تھے اور طب، ہیئت اور ریاضی جیسے طبیعی علوم بھی۔ خاص بات یہ ہے کہ ہمارے علما نے بڑی دیانت کے ساتھ ان علوم کو منتقل کیا۔

اس وجہ سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ علوم صحیح طریقے سے منتقل نہیں ہوئے یا ان کی صحیح ترجمانی نہیں ہوئی۔ دنیا تسلیم کرتی ہے کہ مسلمانوں کی وجہ سے یہ علوم محفوظ ہوگئے ورنہ امتداد زمانہ کے ساتھ یہ ختم ہوجاتے۔ مامون کے زمانے میں ترجمے کے اس کام میں بعض غیر مسلم بھی شریک رہے۔ ان علوم کے عام ہونے سے دینی نقطۂ نظر سے بعض نئے سوالات ابھرنے لگے اور ان پر بحث ومباحثہ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ان علوم نے جو سوالات پیدا کیے وہ خالص دینی علوم سے متعلق سوالات سے بڑی حد تک مختلف تھے۔ دینی علوم کے سلسلے میں عام طور سے جو سوالات ابھرتے تھے وہ اس طرح کے تھے کہ فلاں آیت کی شان نزول کیا ہے؟ اس کا تعلق کس واقعے سے ہے؟ یہ عام ہے یا خاص؟ فلاں حدیث کسی آیت سے متصادم تو نہیں ہے؟ فلاں روایت کی سند کیسی ہے؟ اس کا کیا مفہوم ہے؟ اور وہ دوسری روایات سے متعارض تو نہیں ہے؟ صحابۂ کرامؓ نے اس کا کیا مفہوم سمجھا؟ تابعین اور فلاں حلقے کے بزرگوں نے کیا معنی مراد لیے؟ اس سے کیا فقہی اور قانونی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے؟ اس پر عمل کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

یونانی علوم کے متعارف ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے وجود، آخرت، رسالت، ملائکہ جیسے بنیادی عقائد زیرِ بحث آگئے۔ کیا اللہ تعالیٰ موجود ہے؟ موجود ہے تو اس کے وجود کے کیا معنی ہیں؟ اس کی کیا صفات ہیں؟ ان صفات کا اس کی ذات سے کیا تعلق ہے؟ رسالت پر ایمان کیوں ضروری ہے؟ کسی معاملے کے حسن وقبح کا فیصلہ عقل کرتی ہے یا اس کے لیے رسول کی راہ نمائی ضروری ہے؟ آخرت کا کوئی امکان ہے یا نہیں؟ ملائکہ کا کیا تصور ہے؟

جو یونانی علوم منتقل ہوئے ان میں منطق بھی تھی۔ منطق اپنی بات کو مربوط اور مدلّل طریقے سے پیش کرنے کا فن ہے۔ اس سے یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ آدمی اپنے دعوے کو ایک ترتیب سے اس طرح ثابت کرسکے کہ مخالف اس کا انکار نہ کرسکے۔ اس طرح ایک نیا علم کلام وجود میں آیا، جس میں الٰہیات یا مابعد الطبیعیات کے مسائل زیر بحث آئے۔ الٰہیات کے علاوہ طبیعی علوم کی طرف بھی مسلمانوں کی توجہ رہی۔ طب،

ہیئت، کیمیا، جغرافیہ، ریاضی اور حیاتیات جیسے میدانوں میں انھوں نے یونان، ہندستان اور دیگر ممالک کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا اور انھیں غیر معمولی ترقی عطا کی اور وہ خاص مسلمانوں کے علوم قرار پائے۔ اسے انھوں نے عام انسانوں کی فلاح و بہبود اور اسلام کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کے حدودِ مملکت جب وسیع ہوئے اور نئے ممالک پر ان کی حکومت قائم ہوئی تو فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ ان ممالک میں نمازوں کے اوقات کیا ہوں گے؟ طلوع وغروب اور زوال کا ٹھیک ٹھیک تعین کیسے ہوگا؟ اس پر مسلمان ہیئت دانوں نے جو تحقیق کی، صدیاں گزر گئیں ان کی تردید نہ ہوسکی۔ سمتِ قبلہ میں کہیں غلطی نہ ہوئی اور اوقاتِ نماز میں ایک منٹ کا فرق نہیں آیا۔

انسان کی ایک بنیادی ضرورت یہ ہے کہ اسے علاج کی سہولت حاصل ہو۔ اس مقصد سے مسلمانوں نے طب کی طرف توجہ کی۔ طب یونانی کو انھوں نے اس قدر ترقی دی کہ اسے خاص مسلمانوں کی طب کہا جاسکتا ہے۔ اس میدان میں انھوں نے جو نئے نئے تجربات کیے موجودہ تحقیقات ان کی تائید کرتی ہیں۔

اس طرح اب قرآن، حدیث اور فقہ جیسے خالص اسلامی علوم، جنھیں علوم نقلیہ بھی کہا جاتا ہے، کی تعلیم کے ساتھ علوم عقلیہ (علمِ کلام اور علوم طبیعی) بھی تعلیم کا حصہ بن گئے اور مدارس میں ان کی تعلیم ہونے لگی۔ عربی مدارس کا باقاعدہ قیام چوتھی صدی ہجری سے شروع ہوگیا۔ مصر کا جامعہ ازہر فاطمیوں کے عہد سلطنت میں قائم ہوا۔ یہ المعز لدین اللہ کا دور (۳۵۸ھ تا ۳۶۵ھ) تھا۔ یہ ادارہ اپنا ہزار سالہ جشن منا چکا ہے۔ بغداد کے نظامیہ نے، جسے جدید اصطلاح میں یونیورسٹی کہا جائے گا، بڑی شہرت حاصل کی۔ سلجوقیوں کے دور میں ۴۵۸ھ میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ برصغیر میں بھی عربی مدارس کا سلسلہ صدہا سال سے قائم ہے۔ یہ مدارس آزاد بھی رہے ہیں اور بسا اوقات ان کو حکومت کا تعاون بھی حاصل رہا ہے۔ ان کی پوری ایک تاریخ ہے۔ برصغیر کے عربی مدارس میں تقریباً ڈھائی سو برس سے عام طور پر درس نظامی رائج ہے۔ یہاں اسی سے متعلق بعض باتیں عرض کی جارہی ہیں۔

درسِ نظامی

درس نظامی ملاّ نظام الدین سہالوی ثم فرنگی محلی کا مرتب کردہ ہے۔ ملاّ نظام الدین کی پیدائش ۱۶۷۷ء کی ہے۔ ان کی وفات ۱۷۴۸ء میں ہوئی۔ اس طرح ۷۵ / سال انھوں نے عمر پائی۔ ان کے آباء و اجداد افغانستان کے علاقے ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ لکھنؤ سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک مقام سہالی ہے، وہاں آباد ہوگئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کردیا۔ جب بادشاہ وقت اکبر کے علم میں یہ بات آئی کہ ایک بزرگ ہرات سے آئے ہیں اور ان کے خاندان میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے تو سہالی میں اس نے ایک بڑی جائداد ان کے نام وقف کردی۔ اتنی بڑی جائداد کہ اس سے ان کے خاندان کی کفالت ہو اور وہ خود بھی اطمینان سے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھ سکیں اور جو طلبہ حصول علم کے لیے ان کے یہاں آئیں ان کے قیام و طعام کا بھی انتظام ہوسکے۔ لیکن زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ ان کی عزت و سربلندی دیکھ کر سہالی کے عثمانیوں نے ان کو پریشان کرنا شروع کردیا۔ بالآخر ملاّ نظام الدین کے والد ملاّ قطب الدین لکھنؤ منتقل ہوگئے۔ یہ اورنگ زیب کا زمانہ تھا۔ اورنگ زیب کو معلوم ہوا تو اس نے اس خاندان کی خدمات کے پیشِ نظر ان کو لکھنؤ میں جگہ دی اور ایک بڑی کوٹھی ان کے نام وقف کردی، جو فرنگی محل کے نام سے معروف ہے۔ اسے فرنگی محل اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں فرنگی تاجروں کا عرصے تک قیام رہا۔ جنگِ آزادی میں خاندانِ فرنگی محل کا بڑا حصہ رہا ہے۔ اس خاندان میں تصوف اور بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مولانا عبد الباری فرنگی محلی، جن کا جنگ آزادی میں نمایاں رول رہا ہے اور ملک کے سیاسی لیڈروں سے بھی جن کے قریبی روابط تھے، اسی خاندان کے فرد تھے۔ یہ خاندان جب فرنگی محل منتقل ہوا تو اس وقت ملاّ نظام الدین کی عمر ۱۱، ۱۲ سال کی تھی۔ لکھنؤ پہنچنے کے بعد اس خاندان نے درس و تدریس کا قدیم سلسلہ شروع کردیا۔ آہستہ آہستہ اس کا اعتبار قائم ہوا، لوگ ان کی طرف رجوع کرنے لگے اور مختلف مسائل میں فتوے بھی

یہاں سے جاری ہونے شروع ہوگئے۔ ملاّ نظام الدین نے ملک کے متعدد نام ور علماء سے علم حاصل کیا اور اس میں مہارت حاصل کی۔ تقویٰ وطہارت جیسے اعلیٰ اوصاف بھی، جن میں ان کا خاندان ممتاز تھا، ان میں پائے جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ لوگوں کا مرجع بن گئے۔ انھوں نے درس و تدریس کے کام کے ساتھ بعض کتابوں پر حاشیے بھی لکھے (حواشی دراصل کتابوں کی ایڈیٹنگ ہوتی تھی۔ یہ فن مغرب نے مسلمانوں سے سیکھا اور اسے ترقی دی)

ملاّ نظام الدین نے اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر مدارس کے لیے ایک نصاب (Course) تیار کیا، جسے ان کے نام کی مناسبت سے درسِ نظامی کہا جانے لگا۔ اس میں زیادہ تر زور اس بات پر رہا کہ عربی زبان سے اچھی واقفیت حاصل ہو۔ اس کے لیے انھوں نے صرف ونحو اور ادب کی بعض کتابیں تجویز کیں۔ بلاغت و معانی کی بھی دو ایک کتابیں رکھیں۔ اس کے ساتھ منطق، فلسفہ اور علم کلام اور تفسیر و حدیث وغیرہ کی کتب بھی درس میں شامل تھیں۔ یہ نصاب گیارہ علوم پر مشتمل تھا، کہ ایک عالمِ دین کو ان گیارہ علوم سے واقفیت ہونی چاہیے۔ اسی طرح ان کا زور اس بات پر تھا کہ بچوں کو مختصر کتابیں پڑھائی جائیں، زیادہ لمبی چوڑی کتابیں نہ ہوں اور اگر ضخیم کتابیں پڑھائی جائیں تو ان کے کون سے ابواب یا مباحث پڑھائے جائیں اس کا بھی نصاب مقرر کیا۔

ملاّ نظام الدین کے تجویز کردہ نصاب میں بعض چیزوں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ عربی صرف ونحو کی تعلیم و تدریس کے لیے فارسی کتابیں تجویز کی گئیں۔ جیسے میزان منشعب، نحومیر، صرف میر، فصول اکبری۔ یہ ساری کتابیں فارسی میں ہیں۔ اس کے لیے طالب علم کو پہلے فارسی پڑھنی پڑتی تھی، پھر فارسی کے ذریعے وہ عربی گرامر سیکھتا تھا۔ یہ ایک غیر فطری طریقہ ہے۔ اس میں کافی وقت ضائع ہوتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم بچے کی مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ اس نصاب کی دوسری خامی یہ تھی کہ اس میں اس بات کی کوشش ہوتی تھی کہ بعض مختصر کتابیں لڑکے حفظ کرلیں۔

مائۃ عامل، نحو کی ایک بہت مختصر کتاب ہے۔ اس میں نحو کے مسائل اشعار میں بیان ہوئے ہیں۔ طلبہ انھیں سوچ سمجھے یا بے سوچ سمجھے حفظ کرلیا کرتے تھے۔ اس نصاب کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اس میں معقولات پر زیادہ زور تھا۔ اس میں منطق، فلسفہ، ہیئت، علم کلام اورعقائد پر جتنی توجہ دی گئی تھی، قرآن و حدیث پر بہ ظاہر اتنی توجہ نظر نہیں آتی۔ حدیث میں مشکوٰۃ، جو کہ آٹھویں صدی میں خطیب تبریزی کا مرتب کردہ ایک مجموعۂ احادیث ہے، اس پر حدیث کی تعلیم ختم ہوجاتی تھی اور تفسیر میں جلالین پڑھائی جاتی تھی جو تفسیروں میں مختصر ترین تفسیر ہے۔ اس کے ذریعہ طالب علم کے لیے کسی بھی مسئلے کو تفصیل سے سمجھنا اور اطمینان حاصل کرنا دشوار تھا۔ غالباً پیشِ نظر یہ تھا کہ طالب علم یونانی افکار سے اچھی طرح واقف ہوجائے، تاکہ وہ مخالفین کا جواب دے سکے۔ اس کے ساتھ اسلام کی تعلیم بھی ضروری حد تک ہوجائے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا مرتب کردہ نصاب

ملاّ نظام الدین کے مرتب کردہ نصاب کے ساتھ ایک اور نصاب بھی ہندستان میں جاری تھا۔ یہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۳ء) کا مرتب کردہ تھا۔ حضرت شاہ صاحب ہندستان میں جاری نصاب سے واقف تھے۔ اسی کے مطابق انھوں نے تعلیم پائی تھی اور اسی کی تدریس میں انھوں نے وقت بھی گزارا تھا۔ بعد میں انھوں نے دیارِعرب کا سفر کیا۔ وہاں کے علماء سے استفادہ کیا اور شیخ ابو طاہر الکردی المدنی سے حدیث میں سند حاصل کی۔ اس کا اثر ان کے مرتب کردہ نصاب میں نظر آتا ہے۔ اس میں یونانی علوم یعنی معقولات کا حصہ کم کیا گیا اور قرآن وحدیث کا حصہ زیادہ رکھا گیا۔ قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر، حدیث میں مشکوٰۃ کے علاوہ مؤطا اور صحاح ستہ جو حدیث کی مشہور کتابیں ہیں اس میں شامل تھیں۔ درس نظامی میں فقہ حنفی کا غلبہ رہا ہے۔ شاہ صاحب نے کوشش کی کہ چاروں فقہوں سے طالب علم کی واقفیت ہو اور ان میں تطبیق کا ذہن فروغ پائے۔ اس پہلو سے شاہ صاحب کے یہاں دوسرے علوم کے مقابلے میں حدیث

پر زیادہ زور تھا۔ اگرچہ درس نظامی کی طرح شاہ صاحب کے نصاب کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی، لیکن اس کا ایک حصہ درس نظامی میں شامل ہوگیا۔اب جو درس نظامی ہے وہ صرف ملاّ نظام الدین ہی کا نہیں ہے، بلکہ اس میں شاہ ولی اللہؒ کی ترمیمات بھی شامل ہیں۔

برصغیر میں احناف کی اکثریت ہے۔ اس کے ساتھ مسلک اہل حدیث کے حامل بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ یہ دونوں ہی حلقے حدیث میں حضرت شاہ صاحب سے نسبت رکھتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے علوم کے وارث آپ کے صاحب زادے حضرت شاہ عبد العزیز (م۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۳ء) ہوئے۔ ان کے تلامذہ میں ان کے نواسے شاہ محمد اسحاق (م۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء) بھی ہیں جو ان کے علمی جانشین تھے۔ ان سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (م ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) کو شرف تلمذ حاصل ہے، جن کا شمار بانیانِ دار العلوم دیوبند میں ہوتا ہے۔ دار العلوم دیوبند، جیسا کہ سب جانتے ہیں، فقہ حنفی کی تعلیم و تدریس کا ایک اہم مرکز ہے۔

دوسری طرف شاہ محمد اسحاقؒ کے ایک شاگرد شیخ الکل حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلویؒ ہیں۔ اکثر علماء اہل حدیث کا سلسلۂ روایتِ حدیث ان تک پہنچتا ہے۔ حدیث کی نشر و اشاعت میں ان کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔

ضمناً ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور سرسید احمد خاںؒ (م۱۸۹۸ء) دونوں ہی شاہ محمد اسحاق کے شاگرد تھے۔ سرسید کے اندر تقلید سے دوری اور بہ راہ راست حدیث سے استفادے کا جو رجحان رہا ہے، وہ بہ ظاہر شاہ محمد اسحاق سے نسبت اور حدیث میں استفادے کا نتیجہ ہے۔

مدارسِ دینیہ کا نصاب تعلیم

مدارس کے نصاب میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ہمیشہ ہوتی رہی ہے۔ جامعۂ ازہر کے نصاب میں شیخ محمد عبدہٗ نے بعض تبدیلیاں تجویز کی تھیں۔ ہندستان کے مدارس کا نصاب بھی بے لچک نہیں رہا۔ اس میں بتدریج جو تبدیلی آتی رہی ہے، اس کا احاطہ بہت مشکل

ہے۔ یہاں کے نصاب میں تبدیلی کی زوردار آواز غالباً مولانا شبلیؒ (م ۱۹۱۴ء) نے سب سے پہلے اٹھائی۔ لیکن اس کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔ دیگر اصحاب علم نے بھی اس کی ضرورت محسوس کی۔ اس کے باوجود اب بھی بعض مدارس کا قدیم نصاب کم ہی تبدیل ہوا ہے، لیکن بعض مدارس کے نصاب میں کافی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ یہاں اس کے بعض پہلوؤں کا ذکر کیا جارہا ہے:

۱- کسی اجنبی زبان کی تعلیم کے لیے موجودہ دور میں نئے تجربات کیے گئے ہیں۔ اسے آسان سے آسان بنانے کی کوشش ہوئی ہے، تاکہ کم وقت میں وہ زبان سیکھی جاسکے۔ عربی زبان کی تعلیم کے سلسلے میں بھی اس طرح کے تجربات ہوئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے جو کتابیں مرتب کی گئی ہیں، بہت سے عربی مدارس ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان مدارس نے اپنے طور پر بھی ابتدائی درجات کے لیے اپنا نصاب تیار کیا ہے اور قدیم کتابوں کی جگہ نئی کتابیں ان کے ہاں شاملِ نصاب ہیں۔

۲- قدیم نصاب میں عربی ادب کی نثر و نظم کی اعلیٰ کتابیں کم تھیں۔ لیکن اب بعض مدارس میں قدیم شعرائے جاہلیت کے کلام میں 'سبع معلقات' کے علاوہ بعض دوسرے شعراء کے دواوین بھی شامل ہیں۔ نثر میں مقامات بدیع الزماں ہمدانی یا 'مقامات حریری' جیسی مغلق اور پر تصنّع کتابوں کی جگہ سبک اور رواں تحریریں پڑھائی جانے لگی ہیں۔ بعض مجموعے بھی اس مقصد سے تیار کیے گئے ہیں۔

۳- قدیم نصاب جس مقصد سے مرتب کیا گیا تھا، اس میں شاید تاریخ اور سیرت کی اہمیت محسوس نہیں کی گئی۔ حالاں کہ کسی بھی امت کے لیے اپنے ماضی سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ اس سے اسے حوصلہ بھی ملتا ہے اور اپنی کم زوریوں کی اصلاح کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔ عربی مدارس میں سے معدودے چند ہی نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ چناں چہ ان مدارس میں رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کی سیرت کے ساتھ بنو امیہ اور بنو عباس کی تاریخ بھی پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ مقدمہ ابن خلدون، جو فلسفۂ تاریخ کی اہم کتاب ہے، کہیں کہیں داخلِ نصاب ہے۔

۴- قدیم نصاب میں منطق، فلسفہ اور ہیئت وغیرہ معقولات پر خاصا زور تھا۔ رفتہ رفتہ اس میں کمی آتی چلی گئی۔ اب بعض مدارس میں معقولات صرف اس حد تک رہ گئی ہیں کہ طالب علم ان کی مبادیات سے واقف ہوجائے، تا کہ قدماء کی کتابوں سے استفادے میں کوئی دقت نہ پیش آئے۔

۵- بعض مدارس میں انگریزی اور ہندی بھی شامل نصاب ہے۔ انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہے۔ آج کے دور میں اس سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ ملکی سطح پر ہندی کی خاص اہمیت ہے۔ اسی طرح کچھ مدارس میں سماجی علوم، خاص طور پر معاشیات اور سیاسیات سے ابتدائی واقفیت بہم پہنچائی جاتی ہے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ بعض مدارس میں درسِ نظامی کسی قدر ترمیم کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے اور بعض مدارس میں وہ بالکل بدل گیا ہے اور نئے نصاب نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ یہاں کے طالب علم اس سے بھی بالعموم ناواقف ہیں کہ درس نظامی کیا ہے؟ اس کی تفصیلات کیا ہیں؟ اور ان میں کیا ترمیم ہوتی رہی ہے؟

نصاب میں ان ترمیمات کی وجہ سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دینی مدارس کا مقصد بدل گیا ہے۔ ان مدارس کا مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے اور اب بھی یہی ہے کہ طالب علم کو عربی زبان پر عبور ہو اور وہ قرآن، حدیث اور متعلقہ علوم سے بہ راہ راست استفادہ کرنے لگے اور اس میں یہ صلاحیت پیدا ہوجائے کہ شریعت اسلامی کی صحیح ترجمانی کرسکے، آگے چل کر وہ اس قابل ہوجائے کہ امت کی قیادت اور راہ نمائی کرسکے۔ اللہ کا دین تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اس لیے اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس کی دعوت و تبلیغ اور اس کی سربلندی کی بھی کوشش کرے گا۔

نصاب کی تبدیلی دراصل کتابوں کی تبدیلی ہے، مقصد کی تبدیلی نہیں ہے۔ یہ مقصد سب ہی مدارس کے سامنے ہے، بلکہ یہ بات بھی دیکھی جاتی ہے کہ اب قرآن و حدیث کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ ہے۔

تفسیر قرآنِ مجید

قرآن مجید کی تعلیم کی مختلف صورتیں اختیار کی گئی ہیں۔ کہیں بہ راہ راست قرآن پڑھایا جاتا ہے، طالب علم کومختلف تفاسیر کے مطالعے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اِس ذیل میں مفسرین کی رائیں زیر بحث آتی ہیں اور ان میں ترجیح کی کوشش بھی ہوتی ہے۔ کہیں قرآن مجید کا ایک حصہ مختصر تشریح کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے، جس میں صرف ونحو، لغت اور شانِ نزول سے واقفیت بہم پہنچائی جاتی ہے اور ایک حصے کا درس تفاسیر کے ذریعے ہوتا ہے، تاکہ طالب علم ان کے طریقۂ تفسیر اور خیالات وخصوصیات سے واقف ہوجائے اور دوسری تفسیروں کے مطالعے کی اس میں صلاحیت پیدا ہوجائے۔

جہاں تک نصاب میں تفاسیر کا تعلق ہے، اس کا عام رواج ہے۔ عموماً جلالین پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ بیضاوی کا ایک حصہ (سورۂ بقرہ) شاملِ نصاب ہے۔ کہیں بیضاوی کے اصل ماخذ زمخشری کی 'الکشاف عن حقائق التنزیل' کو ترجیح دی گئی ہے۔ اب کہیں کہیں شوکانی کی 'فتح القدیر' کا ایک حصہ درس میں شامل کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر تجربہ بہ ظاہر کامیاب ہے اور اپنے مقصد کو پورا کر رہا ہے۔

احادیث

قدیم نصاب میں حدیث کی کتاب 'مشکوٰۃ المصابیح' بہت تفصیل سے پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد بخاری، مسلم اور دیگر کتب صحاح کا دورہ ہوتا ہے، تاکہ طالب علم کی نگاہ سے یہ کتابیں گزر جائیں۔ کہیں کہیں اہم مباحث پر گفتگو بھی ہوتی ہے۔

اب رجحان یہ ہے کہ مشکوٰۃ کے بعد کتبِ صحاح کے دورے کی جگہ ان کے ابواب کی تقسیم ہو۔ مثال کے طور پر کسی کتاب سے کتاب الایمان اور عبادات کا حصہ پڑھایا جائے، کسی سے نکاح، طلاق، خلع جیسے امورِ معاشرت کے ابواب رکھے جائیں، کسی سے بیوع اور حدود کے مباحث اور کسی سے فضائل وآداب کے ابواب شاملِ نصاب ہوں۔ اس طرح ان میں سے کوئی کتاب مکمل تو نہ ہوگی، لیکن کتاب کا متعین

حصہ تحقیق سے پڑھایا جاسکے گا اور اس سے کتاب کا انداز اور خصوصیات معلوم ہوجائیں گی۔ طالب علم چاہے تو بعد میں خود سے اس کا مطالعہ کرسکے گا۔

تخصص

دنیائے علم بہت وسیع ہے۔ اب تو اس نے اور وسعت اختیار کرلی ہے۔ ہر موضوع شاخ در شاخ ہوتا چلا گیا ہے اور کسی ایک شعبہ میں بھی مہارت مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے تخصص (Specialization) کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسلامیات کے دائرے میں بھی بہت سے علوم وفنون آتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک فن میں تخصص کا رجحان ہمیشہ رہا ہے۔ اسی سے مفسر، محدث، فقیہ، مورخ، متکلم وغیرہ ہرفن کے ماہرین اور متخصصین پیدا ہوتے رہے ہیں۔ دور جدید میں مدارس عربیہ میں تخصص کو باقاعدہ نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ دین کی دعوت وتبلیغ بھی مدارس کے مقاصد میں شامل ہے۔ ادھر چند سال سے اس سلسلے میں بھی تخصص کا رجحان ابھرا ہے اور داعی اور مبلغ تیار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، جو اسلام کو سلیقہ اور حکمت کے ساتھ پیش کرسکیں۔ تخصص کی ان کوششوں کو بہت کامیاب نہیں کہا جاسکتا۔ ان میں کمیوں اور خامیوں کا احساس ہوسکتا ہے، لیکن اس کا رخ صحیح ہے۔ اس میں اصلاح کی گنجایش ہے جو بتدریج عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

نصاب میں تبدیلی

مدارسِ عربیہ کے نصاب کو، جیسا کہ عرض کیا گیا، قطعی اور ناقابل ترمیم کبھی نہیں سمجھا گیا۔ اس میں حسب ضرورت تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ بعض لوگ اس میں سائنس اور جدید سماجی علوم بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی اہمیت اپنی جگہ ہے، لیکن مدارس کے نصاب میں اس کی تھوڑی بہت گنجایش تو شاید نکالی جاسکتی ہے۔ لیکن بڑے پیمانہ پر جدید علوم کو اس میں داخل نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح کالج اور یونیورسٹی میں دینیات کے دو ایک گھنٹوں (Periods) کے لیے بہ مشکل گنجایش نکالی جاتی ہے، وہی معاملہ عربی مدارس

کا ہے۔ ان میں بھی جدید علوم کے لیے زیادہ وقت نہیں دیا جاسکتا۔ دونوں کے مختلف تقاضے ہیں۔ جدید علوم ہوں یا دینی علوم دونوں طالب علم کا پورا وقت چاہتے ہیں۔ اس کے بغیر اس میں مطلوبہ صلاحیت نہیں پیدا ہوسکتی۔

فارغین مدارس کی معاش کا مسئلہ

مدارس کی تعلیم یا اس کے نصاب کے ساتھ اس کے فارغین کی معاش کا سوال بھی بار بار اٹھتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس نصاب سے فارغ ہونے کے بعد طالب علم کے سامنے معاش کے لیے بالعموم کسی مسجد میں امامت و خطابت اور چھوٹے چھوٹے مکاتب میں تدریس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا۔ اس سے دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے اور محتاجی کی زندگی ان کی قسمت بن جاتی ہے۔

فارغینِ مدارس کی معیشت کا ذکر جس بھیانک طریقے سے کیا جاتا ہے، غالباً وہ صحیح نہیں ہے۔ مسلمان یوں تو تعلیم کے میدان میں پیچھے ہیں، لیکن ان کے جو بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ان کا مشکل سے تین چار فی صد مدارس کے فارغین کا ہوگا۔ باقی ستانوے فی صد سے زیادہ طلبہ، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا رخ کرتے ہیں اور وہیں کی سند رکھتے ہیں۔ ان میں جتنی بے روزگاری ہے، اس تناسب سے مدارس کے فارغین میں نہیں ہے اور وہ ان کی طرح معاشی پریشانی میں بھی مبتلا نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوان کے سامنے معاشی ترقی کی بہت سی راہیں کھلی ہیں۔ اسے بہتر ملازمت مل سکتی ہے، وہ کسی اونچے منصب تک پہنچ سکتا ہے، کاروبار دنیا سے متعلق اسے بہتر معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان سے وہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ عربی مدارس کو ان باتوں کا احساس ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل تدابیر اختیار کی گئی ہیں:

بعض عربی مدارس کے نصاب میں انگریزی اور ہندی کسی حد تک شامل ہے۔ چند سماجی علوم کو بھی اس میں جگہ دی گئی ہے۔ اب تو کمپیوٹر کی تعلیم بھی دی جا رہی ہے۔ ایک

صورت یہ بھی اختیار کی جاسکتی ہے کہ مدارس سے فراغت کے بعد دو ایک سال جدید علوم کے لیے مخصوص کیے جائیں، تاکہ کسی ایک شعبے میں طالب علم کے اندر بہتر صلاحیت پیدا ہوجائے اور حسب ضرورت وہ مقابلہ (Competition) میں بھی حصہ لے سکے۔ اس پر اہل مدارس کو غور کرنا چاہیے۔

ہندستان کی بعض یونیورسٹیاں عربی مدارس کے نصاب کو گریجویشن کے مساوی یا اس سے کم یا زیادہ تسلیم کرتی ہیں۔ جب سے عرب ممالک میں تیل کی دولت آئی ہے اور عربی زبان نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کرلی ہے، مزید یونیورسٹیاں مدارس کے نصاب کو تسلیم کرتی جارہی ہیں۔ خود مدارس کے طلبہ میں یہ رجحان ہے کہ فراغت کے بعد ان یونیورسٹیوں میں داخلہ لیں اور وہاں کی سند حاصل کریں۔ اس طرح کے طلبہ کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے۔ اس سے معاشی میدان میں ان کے لیے مواقع بھی فراہم ہورہے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ دینی تعلیم کا اہتمام امت کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ ہر بستی میں ایسے کسی فرد یا افراد کا ہونا از روئے شریعت ضروری ہے، جو بستی کے رہنے والوں کو دین کی تعلیم دے، انھیں احکام شریعت بتائے اور پیش آمدہ مسائل میں ان کو دینی راہنمائی فراہم کرسکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن وحدیث پر اس کی بہ راہ راست نظر ہو، وہ مختلف مسائل میں اصحاب علم کی رایوں سے واقف ہو اور ان کے سامنے صحیح نقطۂ نظر پیش کرسکے۔ اس طرح کے افراد مدارس ہی فراہم کرتے چلے آرہے ہیں۔ موجودہ حالات میں اس کی کوئی دوسری صورت نظر نہیں آتی۔

جہاں تک ان کی معاش کا مسئلہ ہے، صحیح بات یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست کو اس طرح کے معلمین کی معاشی کفالت کرنی چاہیے اور ان کو اس کا موقع فراہم کرنا چاہیے کہ آزادی کے ساتھ دینی راہنمائی کا فرض انجام دے سکیں۔ لیکن اب جب کہ اسلامی ریاست نہیں ہے تو یہ امت کی ذمہ داری ہے کہ ان کی کفالت اور بہتر معیشت کا نظم

کرے۔ اسے مقامی آبادی پر نہ چھوڑا جائے، بلکہ اس سے وسیع دائرے میں اسے حل کرنے کی کوشش ہو۔ یہ کام صوبائی سطح پر بھی ہوسکتا ہے اور کوشش کی جائے تو ملکی سطح پر بھی اس کا کوئی نظم وجود میں آسکتا ہے۔ اوقاف سے بھی اس میں مدد لی جاسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ پر کما حقہ غور نہیں کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس پر غور ہو اور کوئی بہتر اور باوقار صورت نکالی جائے۔

یہاں ہم ایک خاص مسئلے کی طرف توجہ دلانا چاہیں گے۔

مدارس دینیہ پر دہشت گردی کا الزام

آج کل مدارس کے متعلق یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ ان میں دہشت گردی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اس کے ذریعے دہشت گرد پیدا ہوتے ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ دین اور دین کی تعلیم و تدریس کے خلاف ایک عالمی سازش کا نتیجہ ہے۔ اگر چند باتیں سامنے رکھی جائیں تو اس کی نامعقولیت واضح ہوسکتی ہے۔

۱-سب سے پہلے اس کے پورے نصاب (Curriculum) پر غور کرنا چاہیے کہ کیا یہ طالب علم کو کسی غلط راہ پر لے جاتا ہے؟ کیا اس سے اس کا ذہن تخریب کاری اور دہشت گردی کا بنتا ہے؟ اس نصاب کے تحت یہ شکایت عام ہے کہ اس سے طالب علم زمانے سے بے خبر اور جدید افکار و رجحانات سے نا آشنا رہتا ہے۔ پھر اس سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ماحول کے خلاف بغاوت کے لیے کھڑا ہوجائے گا؟

بعض لوگ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث ہی میں اس کا مواد موجود ہے ۔ یہ ایک اتہام ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس مواد کی نشان دہی کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک اپنے مزعومہ خیالات کو قرآن و حدیث میں زبردستی ڈھونڈ نکالنے کی کوشش نہ کی جائے اور سیاق و سباق سے کاٹ کر ان کی تعلیمات کو نہ

دیکھا جائے، اس طرح کا کوئی حوالہ نہیں پیش کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ قرآن و حدیث کی تعلیم تو ہمیشہ ہوتی رہی ہے۔ صدیوں سے مدارس کا سلسلہ قائم ہے۔ اگر اس سے دہشت گرد پیدا ہوتے ہیں تو یہ نتیجہ ہر دور میں نکلنا چاہیے تھا۔ حیرت ہے کہ جو کارنامہ، صدیوں میں انجام نہیں پایا، اب ایک بڑی طاقت کے اشارے پر وہ مواد بھی نکل آیا اور دہشت گرد بھی پیدا ہونے لگے۔

۲- دینی مدارس پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ ان کا ماحول کیا ہے؟ ان میں کیسی فضا پائی جاتی ہے؟ کن موضوعات پر بحث و تمحیص ہوتی ہے؟ اساتذہ اور طلبا کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں کیا ہیں؟ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ان میں خدا پرستی، انسانوں کے ساتھ ہم دردی، اخلاق، شرافت، تہذیب، ادائے حقوق، ظلم سے اجتناب اور عدل و انصاف کی تعلیم ہوتی یا اس کے برخلاف کوئی دوسری راہ دکھائی جاتی ہے۔ مدارس کے ماحول میں بعض کم زوریوں کی نشان دہی کی جاسکتی ہے، لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں غیر قانونی اور تخریبی نوعیت کی سرگرمیاں جاری ہیں اور ان کی ہمت افزائی ہورہی ہے۔

۳- اب تک جن افراد پر دہشت گردی کے الزام لگے ہیں، ان میں سے بیش تر الزامات محتاج ثبوت ہی رہے ہیں۔ جن افراد پر الزام ہے ان میں ڈاکٹرس، انجینیرس، انفارمیشن ٹیکنالوجی سے متعلق اور جدید تعلیم سے آراستہ افراد، عربی مدارس کے فارغین کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہیں۔ کیا اس بنیاد پر یہ کہا جائے گا کہ کالجوں، یونیورسٹیوں اور جدید ٹیکنیکل اداروں میں دہشت گردی کی تعلیم ہوتی ہے اور وہاں سے تخریب کار پیدا ہوتے ہیں؟ اس طرح کی لغو بات کوئی علم دشمن شخص ہی کہہ سکتا ہے۔ کسی ہوش مند اور صاحب علم سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

۴- دہشت گردی اور تخریب کاری میں بعض غیر مسلم بھی ملوث پائے گئے ہیں۔

آخر ان کی تعلیم کن مدارس میں ہوئی ہے؟ کیا اسے بھی ان کے مذہب اور ان کے تعلیمی اداروں سے اسی طرح جوڑا جاتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ دہشت گردی کے اسباب کچھ اور ہی ہیں۔ جب تک ان اسباب کا ٹھیک سے جائزہ نہ لیا جائے اور انھیں دور کرنے کی کوشش نہ کی جائے دہشت گردی پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ حکومتیں اور فرقہ پرست تنظیمیں نہ یہ اسباب جاننا چاہتی ہیں اور نہ ان کے ازالے کی انھیں فکر ہے۔ وہ ایک خاص طبقے کو نشانہ بنا کر ان اسباب سے توجہ ہٹانا چاہتی ہیں۔ یہ حکمت عملی کسی بھی طرح ملک وقوم کے لیے مفید نہیں کہی جاسکتی۔